محصورین کی منتقلی وآبادکاری۔ ہماری قومی ذمّے داری

انجینئر سید احسان الحق

سقوطِ مشرقی پاکستان کو 32 سال گزر گئے۔ نئے پاکستان میں کتنی ہی فوجی وغیر فوجی حکومتیں تبدیل ہوتی رہیں لیکن پاکستان کے لیے قربانی دینے والے 1971 میں اپنی فوج کے لیے مرمٹنے والے، بنگلہ دیش کے 66 کیمپوں میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے والے ڈھائی لاکھ محبِ وطن پاکستانیوں کی سسکیاں ایوان تک نہ پہنچ سکیں۔ وہ اوران کی نئی نسل سوالی ہے حکم رانوں، ہم وطنوں اوران جنگی قیدیوں (جو ہتھیار ڈالنے کے بعد ہندوستان کی قید کاٹ کر وطن لوٹ گئے) کہ حبّ الوطنی کی سزا کیا کیمپوں میں جانوروں سے بدتر زندگی ہے؟ وہ بھی اُس ملک میں، جو بنگالی زبان کے نام پر ایک اسلامی سلطنت کو توڑ کر مشرقی بازو کے تحفظ میں ہماری ناکامی کے سبب بنا۔ تاریخ گواہ ہے کہ محبِّ وطن پاکستانیوں کا قتلِ عام اسی گراؤنڈ میں شروع ہوا، جب کہ ہتھیار ڈالنے کے دستخط کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ پھر محبِّ وطن پاکستانیوں (جن میں بنگلہ بولنے والی عظیم شخصیات، جن میں فضل القادر چوہدری، مولوی فرید احمد وغیرہ شامل تھے) کو ان کے گھروں سے نکال کر اذیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ غیر بنگالی نوجوان ہزاروں کی تعداد میں شہید کردیے گئے۔ بچے کھچے خاندانوں کو ریڈ کراس نے جھگیوں والے کیمپ میں منتقل کردیا۔ 1972ء میں سہ فریقی معاہدے کے برخلاف صرف نصف تعداد یعنی ڈیڑھ لاکھ محصورین کی وطن واپسی ہوئی اور بقایا ڈیڑھ لاکھ کو بنگالیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔

المیہ صرف اہلِ اقتدار کی بے توجّہی پر ختم نہیں ہوا بلکہ ہماری سیاسی جماعتوں، صحافیوں، دانش وروں، خیراتی اداروں نے بھی انہیں یک سر فراموش کردیا۔ کتنی ہی این جی اوز پاکستان کے علاوہ افغانستان، بوسنیا، عراق، بنگلہ دیش یہاں تک کہ روس میں بھی امدادی سرگرمیاں کرتی ہیں لیکن اپنے ہم وطن ڈھائی لاکھ محصورین کو عیسائی اور دوسری این جی اوز کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے جو نہ جانے کتنوں کا ایمان خرید چکی ہوں گی۔ یہاں میں رابطہ عالمِ اسلامی، اسلامی ترقیاتی بنک اور کچھ غیر سیاسی تنظیموں اور افراد کی تعریف کروں گا جو ان کی امداد کرتے ہیں لیکن یہ تمام محصورین کی ضروریات کا 10 فی صد بھی پورا نہیں کرپاتیں۔

ان ڈھائی لاکھ پاکستانیوں کی کسمپرسی و ناامیدی کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں، جنہوں نے کیمپوں کا دورہ کیا ہے، اس کا تذکرہ کرکے آج ہم ماحول کو افسردہ کرنا نہیں چاہتے۔ مختصراً 66 کیمپوں میں بند جانوروں سے بدتر رہایش، اسکول، نہ بجلی و پانی ونکاسی کا مناسب انتظام، لیکن آج بھی ہلالی پرچم لہراتا ہے۔ گویا 66 کیمپ منی پاکستان ہیں، جس کا خمیازہ ان کے مکینوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بنگالی شرپسندوں کو جب بھی پاکستان پر غصّہ اتارنا ہوتا ہے، ان کی جھگیوں کو آگ لگادیتے ہیں۔ حسینہ واجد کے دور میں یہ معمول تسلسل سے تھا، البتہ خالدہ ضیاء کے آنے کے بعد کافی کم ہوگیا ہے۔ پچھلے دو سال میں ڈھاکا اور رنگ پور کے کیمپوں میں بلڈوزر سے جھگیاں گرانے اور آگ لگانے سے چار ہزار سے زیادہ محصور خاندان جھگیوں سے محروم ہوکر کھلے آسمان تلے رہنے پر مجبور ہوگئے۔ پی ای این سی کے چیئرمین اور کنوینر نے سابق گورنر پنجاب ریٹائرڈ لیفٹننٹ جنرل محمد صفدر سے 2 مئی 2001ء میں محصورین کی منتقلی اور خبر گیری کے لیے مدد کی درخواست کی اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں وفاق سے تعاون حاصل کریں گے۔ خالدہ ضیاء کی حلیف دینی جماعت نے بھی محصورین کو انسانی و دینی ہم دردی کے حقوق دلانے کے لیے کوئی عملی اقدام نہ کیا۔ تقسیمِ مملکتِ خداداد کے بعد سندھ میں 15 لاکھ سے زیادہ بنگالی قیام پذیر ہیں، جو کیمپوں میں نہیں بلکہ ہماری طرح گھروں میں رہتے ہیں۔ ملازمت، تجارت، سیاست، غرضیکہ، زندگی کے ہر شعبہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور اپنی اکائی کی وجہ سے سندھ کے شہری علاقوں کی سیاست میں کنگ میکر (KING MAKER) کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے دینی ولسانی پارٹیاں ان کے ووٹ کو قانونی بنانے کے لیے ان کو پاکستانی شہریت دلانے کی تگ ودو کررہی ہیں۔ گویا ووٹ بینک کے حصول کے لیے بنگالی زبان پر ملک بنانے والوں کے ساتھ تو ہم دردی اور اپنے ہم وطن مظلوم ومحصورین کے ساتھ بے اعتنائی۔ ہمارے یہاں ایسی دینی جماعتیں موجود ہیں (جن کا وجود بنگلہ دیش میں بھی ہے) اور جنہوں نے 1970ء کے انتخاب میں ان غیر بنگالیوں سے اسلام اور پاکستان کے نام پر ووٹ حاصل کیا تھا، تب وہ محصور و مجبور نہ تھے، بلکہ ان کا ووٹ بنک تھا، گھر بار تھا، بینک بیلنس تھا اور وہ شہری حقوق کے تحفظ کے لیے ٹیکس بھی دیتے تھے، لیکن 32 سال سے ان کو حقوقِ شہریت نہیں مل سکے۔

یہ بات باعثِ تقویت ہے کہ وطن کے چند عظیم دانش ور جیسے اے کے بروہی، مولانا ظفر احمد انصاری، حسین امام، جمیل الدین عالی، سینیٹر خورشید احمد،